رضوان اللہ

لے پالک

بعض اوقات بے اولاد جوڑوں کے لیے فطری اور سماجی ضرورتیں اس حد تک ناگزیر ہو جاتی ہیں کہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا کہ وہ کسی اور کے بچے کو لے پالک کر لیں۔ اب ظاہر ہے، جب وہ ایسا کریں گے تو ان کے ہاں یہ شدید خواہش پیدا ہو گی کہ وہ جس بچے کو پالیں، جس کی ضرورتوں کا خیال رکھیں اور جس کو برتاؤ میں اپنے حقیقی بچے کا درجہ دیں، وہ بھی انھیں ماں اور باپ کہہ کر پکارے اور مزید یہ کہ معاشرہ بھی ان کے اس تعلق کو احترام کی نظر سے دیکھے۔ ہمارے خیال کے مطابق اس سارے معاملے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے نامناسب قرار دیا جائے۔ حقیقی والدین کے علاوہ کسی اور کو ماں باپ کا درجہ دینا اور انھیں ماں اور باپ کہہ کر پکارنا، جس طرح ہر مہذب معاشرے کے عرف میں جائز رہا ہے، اسی طرح دین اسلام میں بھی یہ بالکل جائز ہے۔

اس سلسلے میں 'اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ'[1] کی جو آیت پیش کی جاتی ہے، اس بارے میں واضح رہے کہ اس میں نہ تو کسی غیر باپ کو باپ کہنے سے روکا گیا ہے اور نہ کسی اور کے بچے کو بیٹا کہنے سے۔ اگر آیت کا مدعا یہی ہوتا تو پھر لازم تھا کہ کسی غیر ماں کو ماں کہنے سے بھی روک دیا جاتا۔ شارع کے پیش نظر محض نسب کو محفوظ رکھنے کی تعلیم دینا ہے، اس لیے اُس نے یہاں صرف باپ کا ذکر کیا ہے کہ دنیا کے دستور کے مطابق بچے کی نسبت باپ ہی کے حوالے سے بیان ہوتی ہے۔ لہٰذا، ان الفاظ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ بچے کا نسب کسی صورت تبدیل نہ ہو۔ اگر بچے کا حقیقی والد معلوم ہے تو چاہے گود میں لینے والے اپنے آپ کو باپ کہلوائیں، مگر بچے کا

[1] الاحزاب ۳۳: ۵۔ ''تم منہ بولے بیٹوں کو اُن کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک قرین انصاف ہے۔''

نسب اُسی کے نام سے چلے۔ اور اگر بچہ، مثال کے طور پر، گم شدہ یا لاوارث ملا ہے تو بھی کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس کا نسب اپنے آپ سے جوڑے، بلکہ اب وہ بچہ معاشرے میں اسلامی اخوت کے رشتے سے سب مسلمانوں کے ایک بھائی کے طور پر متعارف ہو۔

جہاں تک سورۂ احزاب کی آیت: 'مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ'[۲] کا تعلق ہے، تو اس میں بھی اس طرح کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ حضرت زید کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ بولا بیٹا کہا جاتا تھا۔ ظاہر ہے، منہ سے بول دینے سے کوئی کسی کا حقیقی رشتے دار نہیں ہو جاتا کہ اس کی بنیاد پر نکاح کے معاملے میں حرمت کی بحث ہو۔ نکاح کی حرمت یا تو کچھ مقدس رشتوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے یا پھر خدا کے کسی رشتے کو حرام قرار دے دینے سے، جیسا کہ ازواج مطہرات کے معاملے میں ہوا۔ یہاں حقیقت حال کو بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ آپ زید سمیت، کسی مرد کے باپ نہیں ہیں کہ زید کی مطلقہ سے نکاح کرنے پر کوئی اعتراض اٹھائے۔ باقی رہی یہ بات کہ لوگ زید کو آج کے بعد آپ کا منہ بولا بیٹا کہیں یا نہ کہیں، اس آیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

لیکن اس بارے میں کچھ سنجیدہ سوالات اُس وقت ضرور پیدا ہوتے ہیں جب بچے کی ولدیت کا مرحلہ زیر بحث ہو۔ مثال کے طور پر، ہمارے ملکی قوانین کے مطابق ہر شخص کی شہری شناخت کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے کہ اس کے والد کا نام بیان کیا جائے۔ لیکن جب معاملہ لے پالک کرنے کا ہو تو ہمارے اس قانون میں ایک واضح سقم موجود ہے۔ اس کے حل کے لیے جو تجاویز پیش کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ریاست کی کسی بڑی شخصیت کو ان کا باپ قرار دے دیا جائے۔ ہماری رائے میں اس تکلف کے بجائے یہ سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ جن لے پالک بچوں کے حقیقی والد معلوم ہوں، ان کی ولدیت میں ان کے حقیقی والد ہی کا نام لکھا جائے اور جن کے والد معلوم نہ ہوں، ان کے لیے ان کو گود میں لینے والوں کا سرپرست کے طور پر اندراج کر لیا جائے۔ ہاں، اگر کوئی عام شخص اس کا سرپرست نہ ہو تو پھر کسی بھی ریاستی شخصیت کو اس کا سرپرست قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم جب تک اس مسئلے میں نئی قانون سازی نہیں کر لی جاتی، اس وقت تک اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ گم شدہ اور لاوارث بچوں کے سرپرست اپنا ہی نام ولدیت کے لیے تجویز کر دیں۔ صرف یہ احتیاط رہے کہ وہ اس عمل کو کاغذی کارروائی کی حیثیت سے مجبوراً قبول کریں اور اپنے اردگرد کے ماحول میں حقیقت حال کو مناسب درجے میں واضح کر دینے کا التزام بھی رکھیں۔

۲؎ الاحزاب ۳۳: ۴۰۔ ''(حقیقت یہ ہے کہ) محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔''

کم وبیش یہی صورت حال اس وقت بھی پیدا ہو جاتی ہے جب کسی ادارے کے ملازم کو اپنی اولاد کے لیے مراعات حاصل کرنا ہوتی ہیں۔ یہاں بھی یہی قانون بننا چاہیے کہ جو مراعات اُس ملازم کی حقیقی اولاد کو حاصل ہوتی ہیں، وہی اِس خاص صورت میں اُس کے لے پالک کو بھی حاصل ہو جائیں۔ مگر جب تک یہ مجوزہ قانون بنا نہیں لیا جاتا، اُس وقت تک مجبوری ہے کہ ان مراعات سے دست برداری اختیار کی جائے۔ اس لیے کہ یہاں مسئلہ کسی ناگزیر تقاضے سے عہدہ برآ ہونے کا نہیں ہے، بلکہ اُن حقوق کو حاصل کرنے کا ہے جنھیں ادا کرنے کا اُس اِدارے نے عہد کیا ہے اور نہ وہ اس کا پابند ہی ہے۔

اس معاملے میں کچھ سوالات معاشرتی اور اخلاقی نوعیت کے بھی سامنے آتے ہیں:

ایک یہ کہ گود میں لینے والے مرد وعورت اور اس لے پالک کے درمیان میں حقیقی رشتہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے کیا گھر میں محرم اور غیر محرم کے مسائل پیدا نہیں ہوں گے؟ عرض ہے کہ اس بات کے باوجود کہ ان کے درمیان میں کوئی حقیقی رشتہ قائم نہیں ہوتا، ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کے نتیجے میں اپنائیت اور تقدس کا ایک رشتہ، بہر حال قائم ہو جاتا ہے۔ اور یہ رشتہ اتنا کمزور اور بے وقعت نہیں ہے کہ اس پر اس طرح کے سوالات اٹھا دیے جائیں۔ انسانی فطرت تو اس بارے میں اپنا فیصلہ دے ہی دیتی ہے، دین اسلام بھی اس طرح کے موقعوں پر عذر اور تنگی کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے احکام میں رخصت دیتا ہے۔ جیسے عورتوں کو اخفاے زینت کا حکم دیتے ہوئے جب مستثنیات کو بیان کیا تو اس ذیل میں غلاموں اور زیر دست مردوں جیسے اجنبی لوگوں کو بھی شمار کیا گیا۔[3] اسی طرح اجازت لے کر گھر میں داخل ہونے کے حکم میں بھی غلاموں کو خصوصی رعایت دی گئی۔[4]

دوسرا سوال یہ کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گود میں لیا ہوا بچہ اپنے نئے والدین کی تمناؤں کا مرکز اور اُن کے بڑھاپے کا واحد سہارا بن جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ فطری طور پر چاہتے ہیں کہ ان کا مال ومتاع ان کی موت کے بعد اس بچے کے حصے میں آئے۔ لیکن وراثت کے قانون میں سب حق داروں کا حق طے ہو جانے کے بعد آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ ہماری رائے میں وراثت کے بارے میں جو احکام بیان فرما دیے گئے ہیں، ان سے اِعراض یا ان کے مقرر حصوں میں کمی بیشی کرنے کا حق تو کسی کو حاصل نہیں ہے، مگر وصیت کرنے کا حق میت کو ضرور دیا گیا ہے۔ اس لیے وہ اس بچے کو وصیت کی مد میں جو دینا چاہیں، دے سکتے ہیں۔ اور ان کی یہ وصیت اس لحاظ سے اور بھی خصوصی

۳؎ النور۲۴: ۳۱۔

۴؎ النور۲۴: ۵۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حیثیت رکھتی ہے کہ منفعت کے جس اصول پر خدا نے حصے مقرر کیے ہیں، وہ منفعت بدرجۂ اتم یہاں موجود ہے۔ مزید یہ بات بھی سامنے رہے کہ وراثت اور اس کی تقسیم کی ساری بحث موت کے بعد پیدا ہوتی ہے، اس لیے اگر وہ لوگ چاہیں تو اپنی زندگی ہی میں اس بچے کو اپنے مال کا مالک بنا دے سکتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی جو بار بار تاکید آئی ہے، کیا ان بچوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں اور ان پر بھی کیا لازم ہے کہ وہ اپنے اِن والدین کی خدمت کریں؟ عرض ہے کہ قرآن مجید نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید دو اخلاقی بنیادوں پر کی ہے: بچے کو جنم دینا اور پھر اس کو پالنا پوسنا اور اس کی نگہداشت کرنا۔ پہلے کے لیے حمل، ولادت اور رضاعت کی مشقتوں کو گنوایا ہے اور 'رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا'[5] میں دوسرے کا حوالہ دیا ہے۔ بلکہ ماں کے مقابلے میں باپ کا اولاد کے اوپر جو حق قائم ہوتا ہے، اس میں بنیادی حیثیت اسی پرورش کے عمل کو حاصل ہے۔ لہٰذا، اس بچے پر لازم ہے کہ وہ ولادت کے تعلق سے اپنے حقیقی والدین کے ساتھ اور پرورش اور نگہداشت کی وجہ سے اِن والدین کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرے۔

۵؎ بنی اسرائیل ۱۷: ۲۴۔ ''پروردگار، اُن پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے (رحمت وشفقت کے ساتھ) مجھے بچپن میں پالا تھا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com